کُچھ دیر کا مہمان دِلبندِ علی ہے

کُچھ دیر کا مہمان دِلبندِ علی ہے
زینب درِ خیمے سے یہ سب دیکھ رہی ہے

دریا کی ترائی پہ ہے پیاسوں کا علمدار
ہاتھوں کو کٹائے ہوئے شبیر کا غم خوار
ٹکڑے جو ہوئی مشک وہ سینے سے لگی ہے

اُٹھ اُٹھ کے گرے ہیں کبھی گر گر کے ہیں اُٹھے
لاشے سے لِپٹ کر بہت شبیر ہیں روئے
سینے میں جواں لال کے برچھی کی انی ہے

ماں بُھولے تو کیوں کر بھلا جُھولے سے وہ جانا
ہر اِک کی نِگاہوں سے وہ آنسو کا ٹپکنا
ناوَک علی اصغر کی جب گردن پہ لگی ہے

آغوش میں لے کر شہا بیٹی سے یوں بولے
اے میری سکینہ چلے بابا تیرے مرنے
سینے پہ سُلانے کو اب یہ تیری پھُوپھی ہے

یہ بوسہ گاہِ احمدِ مُرسل ہے اے ظالِم
رگڑے دے ہزاروں مگر بے سُود ہے ظالِم
اُٹھ سینے سے یہ آخری سجدے کی گھڑی ہے

ماں بالوں کا سایہ کیئے مقتل میں کھڑی ہے
گودی میں اُٹھانے کو وہ بے تاب بڑی ہے
لب پر ہے میرا لال اور آنکھوں میں نمی ہے